مسز سیوک: تیرے اعمال سے تیرا منہ سیاہ ہوگا۔ تیری نجات نہ ہوگی۔

یہ کہہ کر مسز سیوک بھی فٹن پر جا بیٹھیں۔ شام ہوگئی تھی۔ سڑک پر عیسائیوں کے دل کے دل کوئی اوورکوٹ پہنے، کوئی ماگھ کی سردی سے سکڑے ہوئے خوش خوش گرجے چلے جا رہے تھے۔ لیکن صوفیہ کو آفتاب کی کمزور کرنیں بھی ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بیٹھ گئی ''تیرے اعمال سے تیرا منہ سیاہ ہوگا'' یہ الفاظ اس کے دل میں نشتر کی طرح چبھتے تھے۔ سوچنے لگی۔ میری تن پروری کی یہی مناسب سزا ہے۔ میں صرف روٹیوں کے لیے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہیں۔ اتنی حقارت اور ذلت برداشت کر رہی ہوں۔ اس گھر میں کون میرا ہمدرد ہے۔ کون ہے جو میرے مرنے کی خبر پا کر آنسو کی چار بوندیں گرا دے؟ شاید میرے مرنے سے لوگوں کو خوشی ہو۔ میں ان کی نظروں میں اتنا گر گئی ہوں۔ ایسی زندگی پر لعنت ہے۔ میں نے دیکھے ہیں۔ ہندو گھروں میں مختلف عقائد کے لوگ کتنی محبت سے رہتے ہیں۔ باپ سناتنی ہے تو بیٹا آریہ سماجی۔ شوہر برہمو سماج میں ہے تو بیوی بت پرستوں میں۔ سبھی اپنے اپنے عقائد پر عامل ہوتے ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں بولتا۔ ہمارے یہاں آتما کچلی جاتی ہے پھر بھی یہ دعوی ہے کہ ہماری تعلیم و تہذیب آزاد خیالی کے معاون ہے! ہیں تو ہمارے یہاں بھی وسیع الخیال لوگ۔ پر بھو سیوک ہی ان کی ایک مثال ہے لیکن ان کی وسیع الخیالی دراصل نافہمی ہے۔ ایسے وسیع الخیال آدمیوں سے تو تنگ خیال ہی اچھے۔ ان میں کچھ یقین کا مادہ تو ہے۔ بالکل بروپے تو نہیں ہیں۔ آخر ماما اپنے دل میں کیا سمجھتی ہیں کہ بات بات پر اپنے سخت کلامی کے تیروں سے مجھے چھیدنے لگتی ہیں۔ ان کے دل میں یہی خیال ہوگا کہ اس کا کہیں اور ٹھکانا نہیں ہے۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہیں ہے۔ میں انہیں دکھا دوں گی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہوں۔ اب اس گھر میں رہنا نرک میں رہنا ہے۔ اس بے حیائی کی روٹیاں کھانے سے بھوکوں مرجانا بہتر ہے۔ بلا سے، لوگ ہنسیں گے، میں آزاد تو ہو جاؤں گی۔ کسی کے طعنے تو نہ سننے پڑیں گے۔

صوفیہ اٹھی اور کسی مقام کو تجویز کیے بغیر ہی احاطہ سے باہر نکل آئی۔ اس گھر کی ہوا اب اس کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ آگے بڑھتی جاتی تھی، پر دل میں لگاتار سوال اٹھ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ جب وہ گھنی آبادی میں پہنچی تو شہدوں نے اس پر ادھر ادھر سے آوازے کسنے شروع کیے۔ مگر وہ شرم سے سر نیچا کرنے کے بجائے ان کی آوازوں اور بری نگاہوں کا جواب نفرت آمیز نگاہوں سے دیتی چلی جاتی تھی۔ جیسے کوئی تیز پانی کی دھار پتھروں کو ٹھکراتی ہوئی آگے بہتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کشادہ سڑک پر آ گئی جو دمسالو میدھ گھاٹ کی طرف جاتی ہے۔

اس کے جی میں آیا ذرا دریا کی سیر کرتی چلوں۔ شاید کسی بھلے آدمی سے ملاقات ہو جائے۔ جب تک دو چار آدمیوں سے شناسائی نہ ہو اور وہ میرا حال نہ جانیں، مجھ سے کون ہمدردی کا اظہار کرے گا۔ کون میرے دل کا حال جانتا ہے۔ ایسے رحم دل اشخاص اتفاق ہی سے ملتے ہیں۔ جب اپنے ماں باپ دشمن ہو رہے ہیں تو دوسرے سے بھلائی کی کیا امید۔

وہ اسی نا امیدی کی حالت میں چلی جا رہی تھی کہ یکا یک اس کو ایک عالی شان محل نظر آیا جس کے سامنے بہت وسیع سبزہ زار تھا۔ اندر جانے کے لیے ایک اونچا پھاٹک تھا جس کے اوپر ایک سنہرا گنبد بنا ہوا تھا۔ اس گنبد میں نوبت بج رہی تھی۔ پھاٹک سے محل تک سرخی کی ایک روش تھی جس کے دونوں طرف بیلیں اور گلاب کی کیاریاں تھیں۔ سبزہ زار پر کتنے ہی مرد عورت بیٹھے ہوئے ماگھ کی سرد سرد ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کوئی لیٹا ہوا تھا۔ کوئی تکیہ دار چوکیوں پر بیٹھا۔ گا رہا تھا۔

صوفیہ نے شہر میں ایسا پر فضا مقام نہ دیکھا تھا۔ اس کو تعجب ہوا کہ شہر کے درمیانی حصہ میں بھی ایسے دلکش مقامات موجود ہیں۔ وہ ایک چوکی پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی ''اب لوگ گرجا سے آ گئے ہوں گے۔ مجھے گھر میں نہ دیکھ کر چونکیں گے۔ تو ضرور سمجھ لیں گے۔ کہیں گھومنے گئی ہو گی۔ اگر رات بھر یہیں بیٹھی رہوں تو بھی وہاں کسی کو کچھ فکر نہ ہو گی۔ آرام

سے کھا پی کر سو جائیں گے۔ ہاں دادا کو ضرور دکھ ہو گا۔ وہ بھی محض اس لیے کہ انہیں بائبل پڑھ کر سنانے والا کوئی نہیں۔ ماما تو دل میں خوش ہوں گی کہ اچھا ہوا آنکھوں سے دور ہو گئی۔ میرا کسی سے تعارف نہیں۔ اسی سے کہا ہے کہ سب سے ملتے رہنا چاہیے۔ نہ جانے کب کس سے کام پڑ جائے۔ مجھے برسوں رہتے ہو گئے اور کسی سے راہ و رسم نہ پیدا کی۔ میرے ساتھ نینی تال میں یہاں کے کسی رئیس کی لڑکی پڑھتی تھی۔ بھلا سا نام تھا ہاں اندو مزاج میں کتنی نرمی تھی۔ بات بات سے محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ ہم دونوں گلے میں باہیں ڈال کر ٹہلتی تھیں۔ وہاں کوئی لڑکی ایسی خوب صورت اور با اخلاق نہ تھی۔ میرے اور اس کے خیالات میں کتنی یکسانیت تھی۔ کہیں اس کا پتہ مل جاتا تو دس پانچ روز اسی کے یہاں مہمان ہو جاتی۔ اس کے والد کا اچھا سا نام تھا۔ ہاں یاد آ گیا۔ کنور بھرت سنگھ۔ پہلے یہ بات نہ سوجھی تھی ورنہ ایک کارڈ لکھ کر ڈال دیتی۔ مجھے بھول تو گیا گئی ہو گی۔ اتنی بے انس تو نہ معلوم ہوتی تھی۔ کم سے کم انسانی اخلاق کی پرکھ ہو جائے گی۔''

مجبوری میں ہمیں ان لوگوں کی یاد آتی ہے ن کی صورت بھی بھول چکی ہوتی ہے۔ پردیس میں اپنے محلّہ کا نائی یا کہار بھی مل جائے تو ہم اس کے گلے مل جاتے ہیں۔ چاہے دیس میں اس سے کبھی سیدھے منہ بات بھی نہ کی ہو۔

صوفیہ سوچ ہی رہی تھی کہ کس سے کنور بھرت سنگھ کا پتہ دریافت کروں۔ اسی اثناء میں محل کے سامنے والے پختہ چبوترہ پر فرش بچھ گیا۔ کئی آدمی ستار، بیلا، مردنگ لیے ہوئے آ بیٹھے اور ان سازوں کے ساتھ سر ملا کر کئی نوعمر لوگ ایک ہی لہجہ میں گانے لگے۔

پاک جنگ میں کبھی بھول کر صبر نہیں کھلونا ہو گا
بجلی کا ہو وار سروں پر نہیں مگر رونا ہو گا
دشمن سے بدلہ کا من میں بیج نہیں بونا ہو گا
گھر میں ان روئی دے کر پھر تجھے نہیں سونا ہو گا
دیش داغ کو خونیں جل سے خوش ہو کر دھونا ہو گا

دیش کاج کی بھاری گٹھڑی سر پر رکھ کر ڈھونا ہو گا
آنکھیں لال بھویں ٹیڑھی کر کرودھ نہیں کرنا ہو گا
بل بیدی پر تجھے خوشی سے چڑھ کر کٹ مرنا ہو گا
فانی ہے یہ جسم موت سے کبھی نہیں ڈرنا ہو گا
سچائی کی راہ چھوڑ کر پیر نہیں دھرنا ہو گا
ہو گی جیت ضرور دھرم کی یہی بھاؤ بھرنا ہو گا
ماتری بھوم کے لیے جگ میں جینا اور مرنا ہو گا

گانے میں نہ کشش تھی نہ لطافت، لیکن وہ طاقت وہ تحریک بھری ہوئی تھی جو ہم آہنگی کا خاصہ ہے۔ ایثار و ترقی کا مقدس پیغام وسیع خلاء میں ساکت آسمان میں اور صوفیہ کے غیر مطمئن دل میں گونجنے لگا۔ وہ ابھی تک مذہبی تحقیقات ہی میں مصروف رہتی تھی۔ قومی پیغام کے سننے کا موقع اسے کبھی نہ ملا تھا۔ شمع سے نور نکلتا ہے۔ اسی طرح صوفیہ کی روئیں روئیں سے وہی آواز نکل رہی تھی ''ماتری بھول کے لیے جگ میں جینا اور مرنا ہو گا!''

اس کے دل میں ایک ترنگ اٹھی کہ میں بھی جا کر گانے والوں کے ساتھ گانے لگتی۔ طرح طرح کے جذبات و خیالات پیدا ہونے لگے ''میں کسی دور دراز ملک میں جا کر ہند کی فریاد سناتی۔ یہیں کھڑی ہو کر کہہ دوں۔ میں اپنے کو ملکی خدمت کے لیے بھینٹ کرتی ہوں۔ اپنی زندگی کے مقصد پر ایک تقریر کرتی کہ ہم اپنی قسمت کا رونا رونے کے لیے اپنی تنزل پذیر حالت پر آنسو بہانے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں۔''

سماں بندھا ہوا تھا۔ صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے اسی قسم کے جذبات کی تصویریں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ابھی نغمہ کی آواز گونج رہی تھی کہ اچانک اسی احاطہ کے اندر ایک کھپریل کے مکان میں آگ لگ گئی۔ جب تک لوگ ادھر دوڑے، آگ کے شعلے زیادہ بلند ہو گئے۔ سارا میدان جگمگا اٹھا۔ درخت اور پودے چمک دار روشنی کے سمندر میں نہا اٹھے۔ گانے والوں نے

فوراً اپنے اپنے ساز وہیں چھوڑے۔ دھوتیاں سمیٹ کر باندھیں۔ آستینیں چڑھائیں اور آگ بجھانے دوڑے۔ محل کے اندر سے اور بھی کتنے نوجوان نکل پڑے۔ کوئی کنوئیں سے پانی لانے دوڑا۔ کوئی آگ کے منہ میں گھس کر اندر کی چیزوں کو نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ لیکن کہیں وہ پریشانی، وہ گھبراہٹ، وہ سراسیمگی، وہ کہرام، وہ دوڑو دوڑو کا شور، وہ خود کچھ بھی نہ کرتے ہوئے دوسروں کو حکم دینے کا خلل نہ تھا۔ جو ایسی آسمانی مصیبتوں کے نزول کے موقعوں پر بالعموم ہوا کرتا ہے۔ سبھی لوگ ایسے عمدہ اور باقاعدہ طریقہ پر اپنا اپنا کام کر رہے تھے کہ ایک بوند پانی بھی بیکار نہ گرنے پاتا تھا۔ آگ کا زور بھی لحہ لحہ کم ہو رہا تھا۔ لوگ ایسی خوبی سے آگ میں کودتے تھے، گویا وہ پانی کا حوض ہے۔

ابھی آگ اچھی طرح نہ بجھی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔ دوڑو دوڑو! آدمی ڈوب رہا ہے۔ محل کی دوسری طرف ایک پختہ تالاب تھا جس کے کنارے جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ گھاٹ پر ایک چھوٹی سی کشتی کھونٹے سے بندھی ہوئی پڑی تھی۔ آواز سنتے ہی آگ بجھانے والی جماعت سے کئی آدمی نکل کر تالاب کی طرف لپکے اور ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لیے پانی میں کود پڑے۔ ان کے کودنے کی آواز دھم دھم صوفیہ کے کانوں میں پڑی۔ ایشور کا کیسا قہر کہ ایک ساتھ ہی دو خاص عناصر میں یہ ہیجان! اور ایک ہی جگہ پر! وہ اٹھ کر تالاب کی طرف جانا ہی چاہتی تھی کہ دفعتاً اس نے ایک شخص کو پانی کا ڈول لیے پھسل کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ چاروں طرف آگ فرو ہو چکی تھی۔ لیکن جہاں وہ شخص گرا تھا وہاں اب تک بڑے زوروں کے ساتھ جل رہی تھی۔ آگ کی لپٹ اپنا خوف ناک منہ کھولے ہوئے اس بدنصیب شخص کی طرف لپکی۔ وہ لپیٹ اس کو نگل جاتی لیکن صوفیہ بجلی کی تیزی کے ساتھ شعلہ کی طرف دوڑی اور اس شخص کو کھینچ کر باہر نکال لائی۔ یہ سب ایک لمحہ میں ہو گیا۔ غریب آدمی کی جان بچ گئی، لیکن صوفیہ کا نازک جسم آگ کی لپٹ میں جھلس گیا۔ وہ شعلوں کے حلقہ سے باہر آتے ہی بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی!

صوفیہ نے تین روز تک آنکھیں نہیں کھولیں۔ دل نہ جانے کس کس دنیا کی سیر میں

مصروف تھا۔ کبھی عجیب، کبھی خوف ناک نظارے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی یسوع کی شانت مورتی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ کبھی کسی عقیلہ خاتون کی چاندسی صورت کے درشن ہوتے۔ جنہیں یہ سینٹ میری سمجھتی۔

جب چوتھے روز صبح کے وقت اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے کو ایک آراستہ کمرہ میں پایا۔ گلاب اور صندل کی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے کرسی پر وہی خاتون بیٹھی ہوئی تھی جس کو اس نے حالت خواب میں سینٹ میری سمجھا تھا اور سرہانے ایک سن رسیدہ شخص بیٹھا ہوا تھا، جس کی آنکھوں سے رحم ٹپکا پڑتا تھا۔ انہیں کو شاید اس نے نیم خوابی کی حالت میں عیسیٰ سمجھا تھا۔ خواب محض یا دداشت کی تکرار ہے۔

صوفیہ نے نحیف لہجہ میں پوچھا ''میں کہاں ہوں؟ ماما کہاں ہیں؟''

بڈھے آدمی نے کہا ''تم کنور بھرت سنگھ کے گھر میں ہو۔ تمہارے سامنے رانی صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ تمہارا جی اب کیسا ہے؟''

صوفیہ: اچھی ہوں پیاس لگی ہے، ماما کہاں ہیں؟ پاپا کہاں ہیں؟ آپ کون ہیں؟

رانی: یہ ڈاکٹر گنگولی ہیں۔ تین دن سے تمہاری دوا کر رہے ہیں، تمہارے پاپا ماما کون ہیں؟

صوفیہ: پاپا کا نام مسٹر جان سیوک ہے ہمارا بنگلہ سگرا میں ہے۔

ڈاکٹر: اچھا تو تم مسٹر جان سیوک کی بیٹی ہو۔ ہم ان کو جانتا ہے۔ ابھی بلاتا ہے

رانی: کسی کو ابھی بھیج دوں

صوفیہ: کوئی جلدی نہیں ہے۔ آ جائیں گے، میں نے جس آدمی کو پکڑ کر کھینچا تھا اس کی کیا حالت ہے؟

رانی: بیٹی! ایشور کی دیا سے وہ بہت اچھی طرح ہے۔ اسے ذرا بھی آنچ نہیں لگی۔ وہ میرا بیٹا ونے ہے۔ ابھی آتا ہوگا۔ تمہیں نے تو اس کی جان بچائی۔ اگر تم دوڑ کر نہ پہنچ جاتیں تو آج نہ جانے کیا ہوتا۔ میں تمہارے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ تم

میرے خاندان کی حفاظت کرنے والی دیوی ہو۔

صوفیہ: جس گھر میں آگ لگی تھی۔ اس کے آدمی سب بچ گئے۔

رانی: بیٹی وہ تو محض تماشا تھا۔ ونے نے یہاں ایک سیوا سمتی بنا رکھی ہے۔ جب شہر میں کوئی میلہ ہوتا ہے۔ یا کہیں سے کسی حادثہ کی خبر آتی ہے تو سمتی وہاں پہنچ کر ضرورت خدمت اور مدد کرتی ہے۔ اس روز سمتی کے امتحان کے لیے کنور صاحب نے یہ تماشا کیا تھا۔

ڈاکٹر: کنور صاحب دیوتا ہیں۔ کتنے غریب لوگوں کی اچھا کرتا ہے۔ یہ سمتی ابھی تھوڑے دن ہوئے بنگال گئی تھی۔ یہاں سورج گرہن کا اشنان ہونے والا ہے۔ لاکھوں جاتری دور دور سے آئے گا۔ اسی کے لیے یہ سب تیاری ہو رہا ہے۔

اتنے میں ایک نوجوان حسینہ وہاں آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے سے شمع روشن کی طرح نور کی کرنیں چھٹک رہی تھیں۔ گلے میں موتیوں کے ہار کے سوا اس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ صبح کی سفید روشنی مجسم نمودار تھی۔

صوفیہ نے اسے ایک لمحہ تک غور سے دیکھا پھر بولی ''اندو! تم یہاں کہاں؟ آج کتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے؟''

اندو چونک پڑی۔ تین دن سے برابر صوفیہ کو دیکھ رہی تھی۔ خیال آتا تھا کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ پر کہاں دیکھا ہے۔ یہ یاد نہ پڑتا تھا۔ اس کی باتیں سنتے ہی یادداشت تازہ ہو گئی۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ گلا بھر آیا۔ بولی ''او ہو صوفی! تم ہو؟''

دونوں سہیلیاں گلے مل گئیں۔ یہ وہی اندو تھی جو صوفیہ کے ساتھ نینی تال میں پڑھتی تھی۔ صوفیہ کو امید نہ تھی کہ اندو اتنی محبت سے ملے گی۔ اندو پچھلی باتوں کو یاد کر کے کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی گلے مل جاتی۔ اپنی ماں سے اس کی تعریف کرنے لگی۔ ماں اس کی محبت کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھی بالآخر صوفیہ نے شرماتے ہوئے کہا ''اندر! ایشور کے لیے اب میری زیادہ تعریف نہ کرو۔ ورنہ میں تم سے نہ بولوں گی۔ اتنے عرصہ تک کبھی خط بھی نہ

لکھا۔ منہ دیکھے کی محبت کرتی ہو"

رانی: نہیں بیٹی صوفی! اندو مجھ سے کئی بار تمہارا ذکر کر چکی ہے۔ یہاں کتنے ہی رئیسوں کی لڑکیاں اس سے ملنے آتی ہیں، پر کسی سے اس کا دل نہیں ملتا۔ کسی سے ہنس کر بولتی تک نہیں۔ تمہارے سوا میں نے اسے اور کسی کی تعریف کرتے نہیں سنا۔

اندو: بہن! تمہاری شکایت بجا ہے۔ پر کروں کیا؟ مجھے خط ہی نہیں لکھنا آتا۔ ایک تو بڑی بھول یہ ہوئی کہ تمہارا پتہ نہیں پوچھا اور اگر پتہ معلوم بھی ہوتا تو بھی میں خط نہ لکھ سکتی۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم ہنسنے نہ لگو۔ میرا خط کبھی ختم نہ ہوتا اور نہ جانے کیا کیا لکھ جاتی۔

کنور صاحب کا معلوم ہوا کہ صوفیہ باتیں کر رہی ہے تو وہ بھی شکریہ ادا کرنے کے لیے وہاں آئے۔ پورے چھ فٹ کے آدمی تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال، لمبی داڑھی، موٹے کپڑے کا ایک لمبا کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ صوفیہ نے ایسا نورانی چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے دل میں رشیوں کی جو شکل قائم کر رکھی تھی، وہ بالکل اسی قسم کی تھی۔ اس بڑے جسم میں بیٹھی ہوئی بڑی آتما دونوں آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ صوفی نے تعظیماً اٹھنا چاہا لیکن کنور صاحب شیریں اور سادہ لہجہ میں بولے "بیٹی لیٹی رہو تمہیں اٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ لو میں بیٹھا جاتا ہوں۔ تمہارے پاپا سے مجھے ملاقات ہے۔ پر کیا معلوم تھا کہ تم مسٹر سیوک کی بیٹی ہو۔ میں نے ان کو بلایا ہے، لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ میں ابھی تمہیں جانے نہ دوں گ۔ یہ کمرہ اب تمہارا ہے اور یہاں سے چلے جانے پر بھی تم کو ایک مرتبہ روزانہ یہاں آنا پڑے گا (رانی سے) جانھوی! یہاں پیانو منگوا کر رکھ دو۔ آج مس سہراب جی کو بلوا کر صوفیہ کی ایک روغنی تصویر تیار کروالو۔ سہراب جی زیادہ ہوشیار ہیں۔ پر میں نہیں چاہتا کہ ان کے سامنے بیٹھنا پڑے۔ وہ تصویر ہم کو یاد دلاتی رہے گی کہ کس نے سخت مصیبت کے وقت ہماری مدد کی۔"

رانی: کچھ اناج بھی دان کرا دوں؟

یہ کہہ کر رانی نے ڈاکٹر گنگولی کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کنور صاحب فوراً

بولے ''پھر وہی ڈھکوسلے! اس زمانہ میں جو غریب ہے، اسے غریب ہونا چاہیے۔ جو بھوکوں مرتا ہے، ایسں بھوکوں مرنا چاہیے۔ جب گھنٹے دو گھنٹے کی محنت سے کھانے بھر کو مل سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کیوں کوئی شخص بھوکوں مرے۔ دان نے ہماری قوم میں جتنے سست آدمی پیدا کر دیئے ہیں، اتنے کل نشوں نے بھی مل کر نہ پیدا کیے ہوں گے۔ دان کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا''

رانی: رشیوں نے بھول کی کہ تم سے صلاح نہ لے لی۔

کنور: ہاں میں ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ آپ لوگ یہ کاہلی، بد اعمالی اور بدی کا بیج بو رہے ہیں۔ دان کاہلی کی جڑ ہے اور کاہلی تمام گناہوں کی جڑ۔ پس دان ہی گناہوں کی جڑ ہے۔ کم سے کم اس کا معاون تو ضرور ہی ہے۔ دان نہیں۔ اگر جی چاہتا ہو دوستوں کی دعوت کر دو۔

ڈاکٹر: صوفیہ! تم راجہ صاحب کا بات سنتا ہے؟ تمہارا یسوع تم دان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تم کنور صاحب سے کچھ نہیں کہتا۔

صوفیہ نے اندو کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ گویا کہہ رہی تھی کہ میں ان کی عزت کرتی ہوں، ورنہ جواب دینے کے نا قابل نہیں ہوں۔

صوفیہ دل ہی دل میں ان لوگوں کی باہمی محبت کا مقابلہ اپنے گھر والوں سے کر رہی تھی۔ آپس میں کتنی محبت ہے! ماں باپ دونوں اندو پر جان دیتے ہیں۔ ایک میں بد نصیب ہوں کہ کوئی منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ چار دن یہاں پڑے ہو گئے، کسی نے خبر تک نہ لی۔ کسی نے کھوج ہی نہ کی ہوگی۔ ماما نے تو سمجھ لیا ہوگا۔ کہیں ڈوب مری ہوگی۔ جی میں خوش ہوں گی کہ اچھا ہوا سر سے ایک بلا ٹل گئی۔ میں ایسے نیک دل لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری ان سے کیا برابری۔

اگر چہ یہاں کسی کے برتاؤ میں رحم کا شائبہ بھی نہ تھا لیکن صوفیہ کو انہیں اپنی اس قدر خاطر و مدارات کرتے دیکھ کر اپنی بے کسی کی حالت پر رنج ہوتا تھا۔ اندو سے بھی تکلف کا

برتاؤ کرنے لگی۔ اندو اس کو محبت سے تم کہتی تھی پر وہ اس کو آپ کہہ کر باتیں کرتی تھی۔

کنور صاحب کہہ گئے تھے۔ میں نے مسٹر سیوک کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ صوفیہ کو اب یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں وہ آ نہ رہے ہوں۔ آتے ہی آتے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں گے۔ میرے سر پھر وہی مصیبت پڑے گی۔ اندو سے اپنی مصیبت کی داستان کہوں تو شاید اس کو مجھ سے کچھ ہمدردی ہو۔ یہ خادمہ یہاں فضول ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اندو آئی بھی تو اس سے کس طرح باتیں کروں گی؟ پاپا کے آنے سے قبل ایک بار اندو سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل جاتا تو اچھا ہوتا۔ کیا کروں؟ اندو کو بلا بھیجوں؟ نہ جانے کیا کرنے لگی؟ پیانو بجاؤں تو شاید سن کر آ ئے۔

اس طرف اندو بھی صوفیہ سے کتنی ہی باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ رانی جی کے سامنے اس کو دل کی باتیں کہنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ خوف تھا کہ صوفیہ کے باپ اس کو لیتے گئے تو میں پھر اکیلی ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر گنگولی نے کہا تھا کہ انہیں زیادہ باتیں نہ کرنے دینا۔ آج اور آرام سے سو لیں تو پھر کوئی اندیشہ نہ رہے گا۔ اس لیے وہ آنے کا ارادہ کر کے ابھی رک جاتی تھی۔ آخر نو بجتے بجتے وہ بے صبر ہو گئی۔ آ کر خادمہ کو اپنا کمرہ صاف کرنے کے بہانے وہاں سے ہٹا دیا اور صوفیہ کے سرہانے بیٹھ کر بولی ''کیوں بہن بہت کمزوری تو نہیں معلوم ہوتی؟''

صوفیہ: بالکل نہیں مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں بالکل اچھی ہو گئی۔

اندو: تمہارے پاپا کہیں تم کو اپنے ساتھ لے گئے تو میری جان نکل جائے گی۔ ان کے آتے ہی خوش ہو کر جاؤ گی اور شاید پھر کبھی میری یاد بھی نہ کرو گی؟

یہ کہتے کہتے اندو کی آنکھیں اشک آلودہ ہو گئیں۔ جذبات کے نامناسب جوش کو ہم اکثر آنسوؤں سے چھپاتے ہیں۔ اندو کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پر وہ مسکرا رہی تھی۔

صوفیہ بولی: آپ مجھے بھول سکتی ہیں، پر میں آپ کو کیسے بھولوں گی؟

وہ اپنا درد دل سنانے کو تھی کہ غیرت نے زبان بند کر دی۔ بات پھیر کر بولی ''میں کبھی کبھی آپ سے ملنے آیا کروں گی۔''

اندو: میں ابھی یہاں سے تم کو پندرہ روز تک نہ جانے دوں گی۔ مذہب کی رکاوٹ نہ ہوتی تو کبھی نہ جانے دیتی۔ اماں جی تم کو اپنی بہو بنا کر چھوڑتیں۔ تمہارے اوپر بے طرح ریجھ گئی ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں تمہاری ہی چرچا کرتی ہیں۔ و نے بھی تمہارے ہاتھوں بکا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ تم چلی جاؤ گی تو سب سے زیادہ رنج اسی کو ہوگا۔ ایک راز کی بات تم سے کہتی ہوں۔ اماں جی تم کو کوئی چیز تحفہ کے طور پر دیں تو انکار نہ کرنا۔ ورنہ ان کو بہت رنج ہوگا۔

اس محبت آمیز ضد نے تامل کا لنگر اکھاڑ دیا۔ جو اپنے گھر میں روزانہ سخت الفاظ سننے کا عادی ہو، اس کے لیے اس قدر ہمدردی کافی سے زیادہ تھی۔ اب صوفیہ کو اندو سے اپنے خیالات پوشیدہ رکھنا آئین دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ دردناک لہجہ میں بولی ''اندو! میرا بس ہوتا تو کبھی رانی جی کے چرنوں کو نہ چھوڑتی۔ پر اپنا کیا بس ہے؟ یہ محبت اور کہاں ملے گی؟''

اندو اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اپنی فطرتی سادگی سے بولی ''کہیں شادی کی بات چیت ہو رہی ہے کیا؟''

اس کی سمجھ میں شادی کے سوا لڑکیوں کے اس قدر غمگین ہونے کا کوئی سبب نہ تھا۔

صوفیہ: میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ شادی نہ کروں گی۔

اندو: کیوں؟

صوفیہ: اس لیے کہ شادی سے مجھی کو اپنی مذہبی آزادی ترک کر دینا ہوگی۔ مذہب آزاد خیالی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ میں اپنی آتما کو کسی مذہب کے ہاتھ نہیں بیچنا چاہتی۔ مجھے ایسا عیسائی شوہر ملنے کی امید نہیں جس کا دل اتنا فیاض ہو کہ وہ میرے مذہبی شکوک سے درگزر کر سکے۔ میں حالات سے مجبور ہو کر حضرت یسوع کو خدا کا بیٹا اور نجات دہندہ نہیں مان

سکتی۔ نہ مجبوری سے گرجا میں ایشور کی عبادت کرنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ میں یسوع کو ایشور تسلیم نہیں کر سکتی

اندو: میں تو سمجھتی تھی کہ تمہارے یہاں ہم لوگوں کے یہاں سے کہیں زیادہ آزادی ہے۔ جہاں چاہو تنہا جا سکتی ہو۔ ہمارا تو گھر سے نکلنا مشکل ہے۔

صوفیہ: لیکن اس قدر مذہبی تنگ خیالی تو نہیں ہے؟

اندو: نہیں کوئی کسی کو پوجا پاٹ کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ بابو جی گنگا اشنان کرتے ہیں۔ گھنٹوں شو جی کی پوجا کرتے ہیں۔ اماں جی کبھی بھول کر بھی اشنان کرنے نہیں جاتیں۔ نہ کسی دیوتا کی پوجا ہی کرتی ہیں۔ پر بابو جی کبھی ہٹ نہیں کرتے۔ بھگتی کا انحصار تو اپنے اعتقاد اور خیال پر ہے۔ ہم بھائی بہن کے خیالات میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے میں کرشن کو مانتی ہو۔ ونے ایشور کی ہستی سے بھی منکر ہے۔ پر بابو جی ہم لوگوں سے کبھی نہیں کہتے اور نہ ہم بھائی بہن میں کبھی اس پر بحث مباحثہ ہوتا ہے۔

صوفیہ: ہماری آزادی جسمانی ہے اور اس لیے جھوٹی۔ آپ کی آزادی روحانی ہے اور اس لیے سچی۔

اندو: تم گرجا کبھی نہیں جاتیں؟

صوفیہ: پہلے جبراً جاتی تھی اب کے نہیں گئی۔ اس پر گھر والے بہت ناراض ہوئے۔ بری طرح میری بے عزتی کی گئی۔

اندو نے محبت آمیز سادگی سے کہا ''وہ لوگ ناراض ہوئے ہوں گے۔ تو تم بہت روئی ہو گی؟''

صوفیہ: پہلے رویا کرتی تھی اب پروا نہیں کرتی۔

اندو: مجھے تو کبھی کوئی کچھ کہہ دیتا ہے تو دل پر تیر سا لگتا ہے۔ دن دن بھر روتی رہی رہ جاتی ہوں۔ آنسو ہی نہیں تھمتے۔ وہ بات بار بار دل میں چبھا کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے کسی کے غصہ پر رونا نہیں آتا۔ رونا آتا ہے اپنے اوپر کہ میں نے کیوں انہیں ناراض کیا۔ کیوں

مجھ سے ایسی بھول ہوئی۔

صوفیہ کو وہم ہوا کہ اندو مجھے اپنی خطا بخشی سے نادم کرنا چاہتی ہے۔ ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ بولی ''میری جگہ پر آپ ہوتیں تو ایسا نہ کہتیں۔ آخر کیا آپ اپنے مذہبی خیالات کو ترک کر دیتیں؟''

اندو: یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں کیا کرتی پر گھر والوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔

صوفیہ: آپ کی ماتا جی اگر آپ کو جبراً کرشن کی عبادت کرنے سے روکیں تو کیا آپ مان جائیں گی؟

اندو: ہاں میں تو مان جاؤں گی۔ اماں کو ناراض نہ کروں گی۔ کرشن تو عالم الغیب ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کے لیے عبادت کی ضرورت نہیں۔ عبادت تو صرف اپنے دل کی تسکین کے لیے ہے۔

صوفیہ: (تعجب سے) آپ کو ذرا بھی دماغی تکلیف نہ ہوگی؟

اندو: ضرور ہوگی پر ان کی خاطر سہہ لوں گی۔

صوفیہ: اچھا اگر وہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی شادی کرنا چاہیں تو؟

اندو: (شرماتے ہوئے) وہ مسئلہ تو حل ہو چکا۔ ماں باپ نے جس سے سمجھا بیاہ دیا۔ میں نے زبان تک نہیں کھولی۔

صوفیہ: ارے یہ کب؟

اندو: اس کو تو دو سال ہو گئے (آنکھیں نیچی کر کے) اگر میرا اپنا بس ہوتا تو ان کو کبھی نہ بیاہتی۔ چاہے کنواری ہی رہتی۔ میرے مالک مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دولت کی کوئی کمی نہیں لیکن میں ان کے دل کے صرف ایک چوتھائی کی مالکہ ہوں۔ اس کے تین حصے رفاہ عام کے کاموں کی نذر ہوتے ہیں۔ ایک کے بدلے چوتھائی پا کر کون آسودہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو باجرے کی پوری بسکٹ کی چوتھائی حصے سے کہیں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بھوک تو رفع ہو جاتی ہے جو کھانا کھانے کا واقعی مقصد ہے۔

صوفیہ: آپ کی مذہبی آزادی میں تو خلل نہیں ڈالتے؟

اندو: نہیں، انہیں اتنی فرصت کہاں ہے؟

صوفیہ: تب تو میں آپ کو مبارک باد دوں گی

اندو: اگر کسی قیدی کو مبارک باد دینا مناسب ہو تو شوق سے دو۔

صوفیہ: زنجیر محبت کی ہو تو؟

اندو: ایسا ہوتا تو میں خود ہی تم سے مبارک باد دینے کے لیے اصرار کرتی۔ میں بندھ گئی وہ آزاد ہیں۔ مجھے یہاں آئے تین مہینے ہوئے۔ آتے ہیں، پر تین دفعہ سے زیادہ نہیں آئے اور وہ بھی ایک ایک گھنٹہ کے لیے! اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دس منٹ میں موٹر آسکتی ہے مگر اتنی فرصت کس کو ہے۔ ہاں خطوط سے اپنی ملاقات کا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ اور وہ خطوط بھی کیسے ہوتے ہیں۔ اول سے آخر تک اپنے دکھڑوں سے بھرے ہوئے۔ آج یہ کام ہے کل وہ کام ہے۔ ان سے ملنے جانا ہے ان کا خیر مقدم کرنا ہے۔ میونسپلٹی کے چیئرمین کیا ہو گئے، راج مل گیا۔ جب دیکھو وہی دھن سوار۔ اور سب کاموں کے لیے فرصت ہے، اگر فرصت نہیں تو صرف یہاں آنے کی! میں تم کو متنبہ کیے دیتی ہوں کسی ملک وقوم کے خادم سے بیاہ نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گی۔ تم اس کے فرصت کے وقت کی محض ایک دل بہلاوے کی چیز رہو گی۔

صوفیہ: میں تو پہلے ہی اپنی رائے قائم کر چکی۔ سب سے الگ ہی الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں میری آزادی میں خلل ڈالنے والا کوئی نہ ہو۔ میں ٹھیک راستہ پر چلوں گی یا غلط پر۔ یہ ذمہ داری بھی اپنے ہی سر لینا چاہتی ہوں۔ میں بالغ ہوں اور اپنا نفع نقصان خود سمجھ سکتی ہوں۔ تمام عمر کسی کی حفاظت میں نہیں رہنا چاہتی کیونکہ اس حفاظت کے معنی غلامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اندو: کیا تم اپنے ماما اور پاپا کے تحت میں نہیں رہنا چاہتی؟

صوفیہ: نا ماتحتی میں نوعیت کا نہیں صرف حدود کا فرق ہے۔

اندو: تو میرے ہی گھر کیوں نہیں رہتیں؟ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی اور اماں جی تو تم کو آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھیں گی۔ میں بھی چلی جاتی ہوں تو وہ اکیلی گھبرایا کرتی ہیں۔ تمہیں پا جائیں تو پھر گلا نہ چھوڑیں۔ کہو تو اماں سے کہوں یہاں تمہاری آزادی میں کوئی دخل نہ دے گا۔ بولو کہوں جا کر اماں سے؟

صوفیہ: نہیں ابھی بھول کر بھی نہیں آپ کی اماں جی کو جب معلوم ہوگا کہ اس کے ماں باپ اس کی بات نہیں پوچھتے تو میں ان کی نظروں سے بھی گر جاؤں گی۔ جس کی اپنے گھر میں عزت نہیں، اس کی باہر بھی عزت نہیں ہوتی۔

اندو: نہیں صوفی! اماں جی کا سوبھاؤ بالکل نرالا ہے۔ جس بات سے تمہیں اپنی بے عزتی کا خوف ہے، وہی بات اماں جی سے عزت پانے کی چیز ہے۔ وہ خود اپنی ماں سے کسی بات پر ناراض ہوگئی تھیں۔ جب سے میکے نہیں گئیں۔ نانی مر گئیں پر اماں جی نے انہیں معاف نہیں کیا۔ سینکڑوں بلاوے آئے، پر ان کو دیکھنے تک نہ گئیں۔ انہیں جوں ہی یہ بات معلوم ہوگی، تمہاری دونی عزت کرنے لگیں گی۔

صوفیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ''بہن میری لاج اب آپ ہی کے ہاتھ ہے''

اندو نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کہا ''وہ مجھے اپنی لاج سے کم عزیز نہیں ہے۔''

ادھر مسٹر جان سیوک کو کنور صاحب کا خط ملا تو آ کر بیوی سے بولے ''دیکھا میں کہتا نہ تھا کہ صوفی پر کوئی مصیبت آ پڑی۔ یہ دیکھو! کنور بھرت سنگھ کا خط ہے۔ تین روز سے ان کے گھر پڑی ہوئی ہے۔ ان کے ایک جھونپڑے میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے بجھانے میں وہ مصروف تھی۔ کہیں لپٹ گئی''

مسز سیوک: یہ سب بہانے ہیں مجھے اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا۔ جس کا دل خدا سے پھر گیا اسے جھوٹ بولنے سے کیا ڈر؟ یہاں سے بگڑ کر گئی تھی۔ سمجھا ہوگا گھر سے نکلتے ہی پھولوں کی سیج بچھی ہوئی ملے گی۔ جب کہیں ٹھکانا نہ لگا تو یہ خط لکھوا دیا۔ اب آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا نے اس کے کفر کی یہ سزا دی ہو۔

جان سیوک: چپ بھی رہو۔تمہاری بے دردی پر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ میں نے تم جیسی سخت دل عورت نہیں دیکھی۔

مسز سیوک: میں تو نہیں جانتی، تمہیں جانا ہو جاؤ!

جان سیوک: مجھے تو دیکھ رہی ہو۔مرنے کی فرصت نہیں ہے۔ اسی پانڈے پور والی زمین کے بارے میں بات چیت کر رہا ہوں۔ایسے موذی سے پالا پڑا ہے۔کہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا۔دیہاتیوں کو جو لوگ سادہ لوح کہتے ہیں، بڑی غلطی کرتے ہیں۔ان سے زیادہ چالاک آدمی ملنا مشکل ہے۔تمہیں اس وقت کوئی کام نہیں ہے۔موٹر منگائے دیتا ہوں۔شان سے چلی جاؤ اور اس کو اپنے ساتھ لیتے آؤ۔

ایشور سیوک وہیں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے ہوئے یاد الٰہی میں محو تھے جیسے بہرا آدمی مطلب کی بات سنتے ہی چونک پڑتا ہے، موٹر کار کا ذکر سنتے ہی دھیان ٹوٹ گیا بولے، ''موٹر کی کیا ضرورت ہے؟ کیا دس پانچ روپے کاٹ رہے ہیں؟ یہاں اڑنے کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہوگا۔کیا گاڑی پر جانے سے شان میں فرق آجائے گا؟ تمہاری موٹر دیکھ کر کنور صاحب رعب میں نہ آئیں گے۔انہیں خدا کی بہتیری موٹریں دیں ہیں۔یسوع! مجھے اپنے دامن میں لو! اب دیر نہ کرو! میری صوفی بیچاری وہاں بیگانوں میں پڑی ہوئی ہے۔نہ جانے اتنے دن کس طرح کاٹے ہوں گے؟ خدا اس کو راہ راست پر لائے۔میری آنکھیں اس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔جب سے وہ گئی ہے کلام پاک سننے کی نوبت نہیں آئی۔یسوع! اسے اپنے دامن میں لے! وہاں اس بیچاری کا کون پوچھنے والا ہے۔ امیروں کے گھر میں غریبوں کا گذر کہاں۔''

جان سیوک: اچھا ہی ہوا یہاں ہوتی تو روزانہ ڈاکٹر کی فیس نہ دینی پڑتی۔

ایشور سیوک: ڈاکٹر کی کیا ضرورت تھی۔اللہ کے فضل سے میں خود تھوڑی بہت ڈاکٹری جانتا ہوں۔گھر والوں کی محبت و تیمارداری ڈاکٹر کی دواؤں سے کہیں زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔میں اپنی بچی کو گود میں لے کر کلام پاک سناتا۔اس کے لیے خدا سے دعا مانگتا۔

مسز سیوک: تو آپ ہی چلے جائیے نا؟

ایشور سیوک: بسر و چشم میرا ٹانگہ منگوا دو۔ ہم سب کو چلنا چاہیے۔ گمراہوں کو محبت ہی راہ راست پر لاتی ہے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ بیٹی! امیروں کے سامنے عاجزی دکھلانی پڑتی ہے۔ ان سے برابری کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔

جان سیوک: مجھے ابھی ساتھ نہ لے جائیے۔ میں کسی دوسرے موقع پر جاؤں گا۔ اس وقت وہاں بجز رسمی شکر گزاری کیا اور کوئی کام نہ ہوگا۔ میں ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ میں اس کے تعارف کو غیبی امداد سمجھتا ہوں۔ اطمینان سے ملوں گا۔ کنور صاحب کا شہر میں خاصا دباؤ ہے۔ میونسپلٹی کے صدر ان کے داماد ہیں۔ ان کی مدد سے پانڈے پور والی زمین مجھ کو بہت آسانی سے مل جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ چند حصے بھی خرید لیں مگر آج ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔

ایشور سیوک: مجھے تمہاری اس فراست پر ہنسی آتی ہے۔ جس آدمی سے ربط ضبط پیدا کر کے تمہارے اتنے کام نکل سکتے ہیں، اس سے ملنے میں بھی تمہیں اتنا تامل ہے۔ تمہارا وقت اتنا قیمتی ہے کہ نصف گھنٹہ کے لیے بھی وہاں نہیں جا سکتے۔ اول ہی ملاقات میں ساری باتیں طے کر لینا چاہتے ہو۔ ایسا سنہرا موقع پا کر بھی تمہیں اس سے فائدہ اٹھانا نہیں آتا۔

جان سیوک: خیر آپ کا اصرار ہے تو میں ہی چلا جاؤں گا۔ میں ایک ضروری کام کر رہا تھا۔ پھر کر لوں گا۔ آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں (بیوی سے) تم تو چل رہی ہو۔

مسز سیوک: مجھے ناحق لے چلتے ہو۔ مگر خیر چلو!

کھانا کھا کر چلنا طے ہوا۔ انگریزی رواج کے مطابق یہاں دن کا کھانا ایک بجے ہوتا تھا۔ درمیانی وقت تیاریوں میں صرف ہوا۔ مسز سیوک نے اپنے زیور نکالے جنہیں انہوں نے عالم ضعیفی میں بھی ترک نہیں کیا تھا۔ اپنا بہترین گون اور بلاؤز نکالا۔ اتنا بناؤ سنگار وہ اپنے سال گرہ کے دن کے علاوہ اور کسی تقریب پر نہ کرتی تھیں۔ مطلب تھا صوفیہ کو جلانا۔

اس کو دکھانا کہ تیرے چلے آنے سے میں رو رو کر مری نہیں جا رہی ہوں۔ کوچوان کو گاڑی دھو کر صاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ پربھو سیوک کو بھی ساتھ لے چلنے کی رائے ہوئی، لیکن جان سیوک نے اس کے کمرہ میں جا کر دیکھا تو اس کا پتہ نہ تھا۔ اس کی میز پر ایک فلسفہ کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا پڑھتے پڑھتے اٹھ کر کہیں چلا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب تین روز سے اسی طرح کھلی پڑی تھی۔ پربھو سیوک کو اسے بند کر کے رکھ دینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ وہ صبح سے دو گھڑی رات گئے تک شہر کا چکر لگایا کرتا۔ صرف دو بار کھانا کھانے گھر آتا تھا۔ ایسا کوئی اسکول نہ تھا جہاں اس نے صوفی کو نہ تلاش کیا ہو۔ کوئی شناسا، کوئی دوست ایسا نہ تھا جس کے گھر جا کر اس نے کھوج نہ کی ہو۔ تمام دن کی دوا دوش کے بعد رات کو مایوس ہو کر لوٹ آتا اور چارپائی پر لیٹ کر گھنٹوں سوچتا اور روتا کہاں چلی گئی؟ پولیس کے دفتر میں دن میں دس دس بار جاتا اور پوچھتا کچھ پتہ چلا؟ اخباروں میں بھی اعلان کر دیا تھا۔ وہاں بھی روزانہ کئی کئی بار جا کر دریافت کرتا۔ اسے یقین ہوتا جاتا تھا کہ صوفی ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ آج بھی حسب معمول ایک بجے تھکا ہوا اور اداس لوٹ کر گھر آیا تو جان سیوک نے مژدہ سنایا کہ صوفی کا پتہ مل گیا۔

پربھو سیوک کا چہرہ شگفتہ وہ گیا بولا ''سچ؟ کہاں ہے؟ کیا اس کا کوئی خط آیا ہے؟''

جان سیوک: کنور بھرت سنگھ کے مکان پر ہے۔ آؤ کھانا کھا لو تمہیں بھی وہاں چلنا ہے۔

پربھو سیوک: میں تو لوٹ کر کھانا کھاؤں گا۔ بھوک غائب ہو گئی ہے تو اچھی طرح؟

مسز سیوک: ہاں ہاں بہت اچھی طرح ہے! خدا نے یہاں سے روٹھ کر جانے کی سزا دے دی۔

پربھو سیوک: ماما! خدا نے آپ کا دل نہ جانے کس پتھر کا بنایا ہے۔ کیا گھر سے آپ ہی آپ روٹھ کر چلی گئی تھی؟ آپ ہی نے اسے نکالا اور اب بھی آپ کو اس پر ذرا رحم نہیں آتا!

مسز سیوک: گمراہوں پر رحم کرنا گناہ ہے۔

پربھوسیوک: اگر صوفی گمراہ ہے تو عیسائیوں میں 99 فیصد آدمی گمراہ ہیں! وہ مذہب کا سوانگ نہیں بھرنا چاہتی۔ اس میں یہی عیب ہے۔ نہیں تو حضرت عیسیٰ پر جتنا اعتقاد اس کو ہے اتنا انہیں بھی نہ ہوگا جو عیسیٰ پر جان دینے کا دم بھرتے ہیں۔

مسز سیوک: خیر معلوم ہو گیا کو تم اس کی وکالت خوب کر سکتے ہو۔ مجھے ان دلائل کے سننے کی فرصت نہیں۔ یہ کہہ کر مسز سیوک وہاں سے چلی گئیں۔ کھانے کا وقت آیا۔ لوگ میز پر بیٹھے۔ پربھوسیوک بہت اصرار کرنے پر بھی نہ گیا۔ تینوں آدمی فٹن میں بیٹھے تو ایشور سیوک نے چلتے چلتے جان سیوک سے کہا ''صوفی کو ضرور ساتھ لانا اور موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ یسوع تمہیں عقل عطا کریں اور کامیابی''

ذرا دیر میں فٹن کنور صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔ کنور صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ مسز سیوک نے دل میں ٹھان لی کہ میں صوفیہ سے ایک لفظ بھی نہ بولوں گی۔ دور ہی کھڑی دیکھتی رہوں گی، لیکن جب صوفیہ کمرہ میں پہنچی اور اس کا پژمردہ چہرہ دیکھا تو دل پر قابو نہ رہا۔ مامتا ابل پڑی۔ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس بہاؤ میں صوفیہ کی دلی کدورت بھی بہہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ ماں کی گردن میں ڈال دیئے اور کئی منٹ دونوں محبت کے روحانی مزہ سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ جان سیوک نے صوفیہ کو پیشانی پر بوسہ دیا مگر پربھوسیوک آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے سامنے کھڑا رہا۔ بہن کو چھوتے ہوئے اسے خوف ہوتا تھا کہ مبادا دل نہ پھٹ جائے۔ ایسے موقعوں پر اس کا دل اور زبان دونوں ساکت و بے کار ہو جاتے تھے۔

جب جان سیوک صوفی کو دیکھ کر کنور صاحب کے ساتھ باہر چلے گئے تو مسز سیوک بولیں ''تجھے اس دن کیا سوجھی کہ یہاں چلی آئی! یہاں اجنبیوں میں پڑے پڑے تیری طبیعت گھبراتی رہی ہوگی۔ یہ لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں تیری بات بھی نہ پوچھتے ہوں گے''

صوفیہ: نہیں ماما یہ بات نہیں ہے۔ گھمنڈ تو یہاں کسی میں چھو تک نہیں گیا ہے۔ سبھی

ہمدردی اور انکسار کے پتلے ہیں۔ یہاں تک کہ نوکر چاکر بھی اشاروں سے کام کرتے ہیں۔ مجھے آج چوتھے دن ہوش آیا ہے، پر ان لوگوں نے اتنی محبت سے تیمارداری نہ کی ہوتی تو شاید مجھے ہفتوں تک بستر علالت پر پڑا رہنا ہوتا۔ میں اپنے گھر میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنے ہی آرام سے رہتی۔

مسز سیوک: تم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی تو کیا یہ لوگ اتنا کرنے سے بھی رہے۔

صوفیہ: نہیں ماما یہ لوگ نہایت خلیق اور نیک ہیں۔ خود رانی جی عموماً میرے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھلتی رہتی ہیں۔ کنور صاحب دن میں کئی بار آ کر دیکھ جاتے ہیں اور اندو سے میرا بہناپا سا ہو گیا ہے۔ یہی لڑکی ہے جو میرے ساتھ نینی تال میں پڑھا کرتی تھی۔

مسز سیوک: (چڑ کر) تجھے دوسروں میں سب وصف ہی وصف نظر آتے ہیں، برائیاں سب گھر والوں ہی کے حصہ میں پڑی ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے مذہب بھی اپنے سے اچھے ہیں۔

پربھو سیوک: ماما! آپ تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ اٹھتی ہیں۔ اگر کوئی اپنے ساتھ اچھا سلوک کرے تو کیا اس کا احسان نہ مانا جائے؟ احسان فراموشی سے برا کوئی عیب نہیں ہے۔

مسز سیوک: یہ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ گھر والوں کی برائی کرنا تو اس کی عادت میں داخل ہے۔ یہ مجھے جتانا چاہتی ہے کہ یہ لوگ اس کے ساتھ مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ دیکھوں یہاں سے جاتی ہے تو کون سی سوغات دے دیتے ہیں۔ کہاں ہیں کہاں ہیں تیری رانی صاحبہ؟ میں بھی ان کا شکریہ ادا کر دوں۔ ان سے اجازت لے لو اور گھر چلو پاپا اکیلے گھبرا رہے ہوں گے۔

صوفیہ: وہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔ وہ یہاں کب کی آ گئی ہوتیں۔ لیکن شاید ہمارے درمیان میں بغیر بلائے آنا مناسب نہ سمجھتی ہوں گی۔